ڈاکٹر طاہر سعید کے نام

ڈاکٹر حافظ محمد مقصود

"اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے"

(گزشتہ سے پیوستہ)

۲- یہ ایک علمی تحریک نہیں ہے۔ اس ضمن میں اس حقیقت کا اظہار و استحضار ضروری ہے کہ دور خلفائے راشدین کے بعد اگرچہ بحیثیت مجموعی امت مسلمہ کے رویے میں تبدیلی شروع ہو گئی تھی، مگر پھر بھی یہ اشخاص و افراد کی تبدیلی تھی، کانسٹی ٹیوشن کی تبدیلی نہ تھی ـــ دستور و آئین اور حدود و تعزیرات قرآن و سنّت ہی کے نافذ تھے۔ کسی نے خدا اور رسولؐ کے قانون کو چیلنج نہیں کیا تھا، کسی نے جنّت و دوزخ کے تصوّر کا مذاق نہیں اُڑایا تھا، کسی نے قیامت کے ظہور و بروز کے نظریے پر پھبتیاں نہیں کسی تھیں۔ دراصل مسلمانوں کے اندر سستی، کاہلی اور بے عملی کے جراثیم در آئے تھے، لہٰذا اس کمی کو دُور کرنے کے لیے ایک اصلاحی یا تبلیغی قسم کی تحریک لازمی اور لابدی تھی۔

مگر آج سے ڈھائی تین سو سال پہلے جب مغربی استعماریت اور شہنشاہیت (WESTERN IMPERIALISM) نے عالم اسلام پر اپنے آہنی پنجے گاڑنے شروع کر دیئے اور بالآخر پورے عالم اسلام کو نہ صرف اپنے ہوس و حرص کے پنجۂ خونیں میں گھیر لیا، بلکہ فکر و فلسفہ کے ایک نئے اور لادینی عفریت کے ساتھ خدا اور رسولؐ، جنّت و دوزخ، فرشتہ و وحی اور قیامت و آخرت جیسے تصورات کو علی الاعلان چیلنج کیا۔ چنانچہ ایسی سنگین صورتِ حال میں محض ایک اصلاحی اور تبلیغی قسم کی کوشش کافی نہیں رہی، بلکہ شدید ترین ضرورت اس امر کی پیدا ہو گئی کہ خود مسلمانوں کے اندر ذہانت و فطانت کی دولت سے مالا مال ایسے نوجوان اٹھیں جو اس لادینی فکر و فلسفہ کے بُت کی دھجیاں بکھیر سکیں۔ ہاں وہی خدا ناشناس اور آدم فریب فکر و فلسفہ جس نے عرب سے لے کر عجم اور مشرق سے لے کر مغرب تک بحیثیت مجموعی پوری نوع

انسانی کے دماغوں سے اللہ تعالیٰ کے تصوّر کو اُچک کر نہ صرف انسان کو انسان کا خونخوار شکاری بنایا بلکہ دنیا کے اس گلستان کو شر و فساد، ذلت و رسوائی، درندگی و خونخواری اور ناصبوری و ناشکیبائی کا ماتم کدہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سائنسی علوم اور فکر و فلسفہ نے نہایت تیزی سے ترقی کرتے کرتے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے ہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ ایک فوق الطبیعی اللہ تعالیٰ کے تصوّر یا عشقِ خداوندی کو سائنسی علوم سے نکال کر اس فکرِ گستاخ نے فطرت کی طاقتوں کو اپنے خلاف عُریاں کر کے اُن بے تاب بجلیوں کے سامنے اپنے ہی آشیانے کو جس بے دردی، بے عقلی اور ناسمجھی سے داؤ پر لگا دیا ہے اس کی حقیقت اور واقعیت کو آج صرف ایک مادرزاد اندھا ہی جھٹلا سکتا ہے۔ سائنسی علوم و فنون نے ایک پہلو سے انسانیت کی خدمت بھی کی ہے مگر اس خدمت کا جو بھاری معاوضہ اس نے چیختی ہوئی ماؤں، لُٹی ہوئی بہنوں، پھٹے ہوئے بارودی ذخیروں سے نکلتے ہوئے دُھوؤں، قلبی، ذہنی اور دماغی عارضوں، بموں اور میزائلوں کے جا بجا پھیلے ہوئے انباروں، توپوں، ٹینکوں اور بندوقوں سے نکلتی ہوئی قہر آلود اور زہر آلود گولیوں کی باڑوں اور گلی کوچوں اور سڑکوں اور شاہراہوں پر گھسٹتی ہوئی بدقسمت اور اعضا بُریدہ انسانی لاشوں کی شکل میں وصول کیا ہے اُس سے زندگی کے ہر موڑ پر ہمیں سابقہ پڑ رہا ہے۔

اقبال اپنے فارسی کلام میں علم (سائنس) اور عشقِ خدا کے مابین ایک مکالمہ پیش کرتا ہے جس میں علم (سائنس) نہایت فخر و استکبار سے دعویٰ کرتی ہے کہ:

نگاہم رازدارِ ہفت و چارست — گرفتارِ کمندم روزگار است
جہاں بینم بایں سُو باز کردند — مرا با آنسوئے گردوں چہ کار است
چکد صد نغمہ از سازے کہ دارم — ببازار افگنم رازے کہ دارم

ترجمہ: میری نظر اس وسیع و عریض کائنات کی رازدار ہے اور زمانہ میری کمند میں گرفتار ہونے کی وجہ سے میرا تابع و محکوم ہے۔ میری آنکھوں کا کام کائنات کی اُن اشیاء کے ساتھ ہے جو مشاہدہ (حواسِ خمسہ) میں آسکتی ہوں اور مجھے اس علمِ حواس سے

پرے اور آسمان سے اوپر کی چیزوں (مثلاً خدا۔ جنّت۔ دوزخ۔ ملائکہ وغیرہ) سے کوئی سروکار نہیں۔ میرے ساز سے سینکڑوں نغمے بلند ہوتے ہیں اور کسی راز کو ظاہر آشکار کرنے کے بعد اسے سرِ بازار لوگوں کے سامنے لے آتی ہوں تاکہ ہر فردِ نوعِ بشر اس سے مستفیض ہو سکے۔

علمِ سائنس کے یہ بلند بانگ دعوے سُن کر عشقِ خداوندی جواب دیتا ہے کہ ؎

زافسونِ تو دریا شعلہ زاراست ہوا آتش گداز و زہر داراست
چو با من یار بودی نور بودی بُریدی از من و نورِ تو ناراست
بہ خلوت خانۂ لاہوت زادی ولیکن در نخِ شیطاں فتادی
بیا ایں خاکداں را گلستاں ساز نہ گردوں بہشتِ جاوداں ساز

اے علمِ سائنس تیری ستم ظریفی اور فتنہ سامانی سے تو دریا بارودی دھماکوں، آتش گیر مادوں، بموں اور میزائلوں کے زیرِ اثر زہریلے اور انسانیت دُشمن شعلہ زار بنے ہوئے ہیں۔ اور پوری فضائے بسیط ایک زہریلا گولہ اور آتشیں گذرگاہ بنی ہوئی ہے۔ جب تک تیری (سائنس) دوستی میرے ساتھ رہی تو ایک بارانِ رحمت اور نورِ نایاب بن کر اپنی باخدا روشنی سے سسکتی ہوئی انسانیت کی شبِ تاریک کو برابر چیرتی پھاڑتی اور روشن کرتی رہی۔ مگر مجھ (تصوّرِ خدا) سے جُدا ہونا ہی تھا کہ تُو (سائنس) ایک غیر ذمہ دار اور شُتر بے مہار کی شکل اختیار کر کے پوری نوعِ انسانی کے حق میں رحمت کے بجائے زحمت اور نُور (روشنی) کی جگہ نار (آگ و آتش و خورشید) بن گئی۔ (اے سائنس تجھے کچھ یاد بھی ہے کہ) جن لوگوں (مسلمانوں) نے تجھ کو باقاعدہ (قرآنِ حکیم کے ارشادات اور محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیماتِ حکمت کی روشنی میں) مدوّن اور مرتّب کیا اُن کا دماغ میرے (عشقِ خدا) نُور سے منوّر اور اُن کا دل میرے سوز سے معمور تھا۔ لیکن بعد میں ایک لادینی اور بے خدا ذہنیت رکھنے والی نوعِ انسانی کے ہاتھ آ کر تو (سائنس) بُری طرح شیطانِ لعین کے جال میں پھنس گئی۔ اے سائنس آ کر دونوں (تصوّرِ خدا + سائنس) مل کر اس کُرّۂ ارضی کو گلستان اور باغ و بہار بنائیں اور آسمان کے نیچے بہشتِ

جا و داں کی بنا ڈالیں !!

پس ایک ایسا فکر و فلسفہ جس نے ایک طویل تخریبی عمل کے ذریعے انسانی عقلوں کو ٹیڑھا اور فطرتوں کو بُری طرح مسخ کر دیا ہے، اس کے طلسم کو توڑنے اور اثرِ بد کو روکنے کے لیے ایک عظیم الشان اور زبردست علمی تحریک کی ضرورت ہے۔ اگر عجم کے لالہ زاروں سے ایسی علمی تحریک نہ اُٹھی تو وہ دن دُور نہیں جب یہ بے خدا اور خونخوار فکر و فلسفہ نہایت سنگدلی کے ساتھ اپنی آتشِ تیز سے نوعِ انسانی کو خاکستر کر کے رکھ دے گا۔

چنانچہ آج ایک اشد ضرورت اِس امر کی پیدا ہو گئی ہے کہ ہم جرسِ کارواں سے بیدار اور گرد و پیش سے خبردار ہو کر اعلیٰ ترین علمی سطح پر ایسے اداروں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں لائیں، جن میں نسلِ جدید کے نوجوانوں کو تعلیم دے کر ان کے باطن میں ایمان و یقین، فکر و نظر اور عقل و دانش کا ایک ایسا مضبوط محور (STRONG AXIS) نصب کر دیا جائے کہ پھر نسلِ جدید کے یہی افراد فلسفی، مفکر، اور اسکالرز بن کر مشرق و مغرب کے پوری لٹریچر مثلاً علومِ عقلی، جیسے منطق، اخلاقیات، نفسیات، الٰہیات، مابعد الطبیعیات، علومِ طبیعی جیسے کیمیا، ریاضی، طبیعیات، فلکیات، اور علومِ عمرانی جیسے قانون، معاشیات اور سیاسیات پر ایک تنقیدی نظر دوڑائیں۔ وہ ؏ "قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں!" کے مصداق قرآن کے اسرار و رموز اور فکر و فلسفہ کے ذریعے عقل و خرد کی ساری گتھیاں سُلجھا کر ؏ "یقیں مثلِ خلیل آتش نشینی" اور ؏ "یقیں اللہ مستی، خود گزینی" کی مانند صاحبِ جنوں اور ؎ "عقل کو تنقید سے فرصت نہیں۔ عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ" کے مظہرِ اتم بن کر اُس پیرِ رومی کی قیادت میں اُسی قافلۂ شوق کے سپاہی بن جائیں جس میں شمولیت کو اقبال بھی اپنے لیے باعثِ فخر و ناز سمجھتا ہے، تاکہ پھر یہ قافلہ نگاہ و سپاہ کی تیغ بازی سے توہمات میں اُلجھے بغیر دلِ وجود کو چیر کر طلسمِ عصرِ حاضر کے لیے توڑ، زمانہ کے زہرِ ہلاہل کے لیے تریاق اور ذہنی و فکری ارتداد اور خودکشی کے

سمِ قاتل کے لیے آبِ حیات کا کام دے سکے۔

یہی خدا پرست نسل دورِ جدید کی محدود اور کوتاہ بین علمیّت اور عقلیت کی پیدا کردہ محدودیتِ نگاہ کے سنگِ گراں کو توڑ کر کائنات کی تحقیق و تجسّس کے ذریعے اَنائے لامحدود اور بقائے خودی کا وہ نظریہ اور فلسفہ اعلیٰ ترین دماغوں میں دلیل و برہان کی قوت سے بٹھا سکتی ہے جس فکر و نظریہ کی عدم موجودگی نے انسان کو غمِ مرگ کا زندانی اور طلسمِ دوش و فردا کا اسیر بنا رکھا ہے، اور یہی توضیح و تفہیم کی اعلیٰ ترین سطح پر ملکِ لازوال اور حیاتِ انسانی کے دوام و تسلسل کا اطمینان دلا کر سرکش دماغِ انسانی کو ع "عقل غیاب و جستجو، عشق حضور و اضطراب" کا پروانہ بنا کر حیاتِ دنیوی کی تنگ دامانی اور آخرت کی حیاتِ جاودانی کا رازدار بنا سکتی ہے۔

شُخمِ گُل کی آنکھ زیرِ خاک بھی بے خواب ہے
کس قدر نشو و نما کے واسطے بے تاب ہے
زندگی کا شعلہ اس دانے میں جو مستور ہے
خود نمائی، خود فزائی کے لیے مجبور ہے
سردیٔ مرقد سے بھی افسردہ ہو سکتا نہیں
خاک میں دب کر بھی اپنا سوز کھو سکتا نہیں
پھول بن کر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ
موت سے گویا قبائے زندگی پاتا ہے یہ
ہے لحد اس قوتِ آشفتہ کی شیرازہ بند
ڈالتی ہے گردنِ گردوں میں جو اپنی کمند
موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے،
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے!

موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات
عام یوں اس کو نہ کر دیتا نظامِ کائنات

ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اَجل کچھ بھی نہیں
جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں
آہ! غافل! موت کا رازِ نہاں کچھ اور ہے!
نقش کی ناپائداری سے عیاں کچھ اور ہے!

پستیٔ عالم میں ملنے کو جُدا ہوتے ہیں ہم
عارضی فُرقت کو دائم جان کر روتے ہیں ہم
مرنے والے مرتے ہیں، لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جُدا ہوتے نہیں

جوہرِ انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں،
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے، فنا ہوتا نہیں

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں
ٹوٹنا جس کا مقدّر ہو یہ وہ گوہر نہیں

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی

قلزمِ ہستی سے تُو اُبھرا ہے مانندِ حباب
اِس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

تُو اِسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

(جاری ہے)